مطبوعات

Muslim Thought And Its Source

تالیف جناب سید مظفر الدین صاحب ندوی ایم اے پروفیسر اسلامیہ کالج کلکتہ۔ ضخامت ۱۶۸ صفحات۔ قیمت للعہ۔ ملنے کا پتہ:۔ دی گریٹ ایسٹرن لائبریری ۱۵۱ کالج اسکویر۔ کلکتہ۔

یہ کتاب مغربی مصنفین کے اس دعوے کی تردید میں لکھی گئی ہے کہ مسلمانوں میں فکری نشو و نما کی ابتدا یونانی عقلیات کے مطالعہ سے ہوئی اور ان کے تمام معقولات اسی سرچشمے سے ماخوذ تھے۔ مؤلف نے اس ادعائے غلط کا ابطال کرنے کے لیے سب سے پہلے مجملاً یہ ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں کو غور و فکر اور تحقیق و تجسس پر ابھارنے والی چیز دراصل حکمت یونان نہیں بلکہ تعلیم قرآن تھی اور اس تعلیم کے اثر سے انہوں نے مسائل حکمت پر اُس وقت سوچنا شروع کر دیا تھا جب یونانی علوم کے متعلق وہ کچھ بھی نہ جانتے تھے۔ اس اجمال کے بعد مؤلف نے تفصیل کا طریق اختیار کیا ہے۔ ابتدائی فکری حرکت نے رفتہ رفتہ مسلمانوں میں جو راہیں اختیار کیں، ان میں سے وہ چار بڑی بڑی راہوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ اعتزال، اشعریت، تصوف اور حکمت یعنی فلسفہ و سائنس۔ پھر ان میں سے ہر ایک پر علٰحدہ علٰحدہ بحث کرتے ہیں۔ پہلے تین مذاہب کے متعلق انہوں نے ثابت کیا ہے کہ ان کی اصل یونانی نہیں بلکہ خالص اسلامی ہے۔ اگرچہ ان مذاہب کے متبعین نے آگے چل کر یونانی اور عجمی علوم سے استفادہ ضرور کیا، لیکن جن مسائل پر انہوں نے بحث کی وہ سب کے سب قرآن کے مطالعہ سے پیدا ہوئے تھے، اور ان کے استدلال کی بنا بھی قرآن ہی پر قائم تھی۔ رہی آخری چیز تو وہ بلاشبہ دوسری قوموں سے مسلمانوں میں آئی مگر مسلمان محض دوسروں کے مترجم اور شارح نہ تھے جیسا کہ مغربی مصنفین کا گمان ہے، بلکہ انہوں نے عقلیات اور طبیعیات کا جس قدر ورثہ دوسروں سے پایا اس

بہت زیادہ دوسروں کے لیے چھوڑا۔

یہ تمام مباحث جو اس کتاب میں بیان ہوئے ہیں اردو زبان میں اس سے پہلے بارہا آچکے ہیں مگر انگریزی میں شائد اب تک کسی نے ان کو اتنی تفصیل کے ساتھ پیش نہیں کیا تھا۔ اس لحاظ سے یقیناً مؤلف کی خدمت قابل قدر ہے لیکن ضرورت تھی کہ ان مباحث کو مولانا شبلی اور جسٹس امیر علی اور ان کے عہد کے لوگوں نے جہاں چھوڑا تھا، مؤلف اس مقام سے آگے بڑھتے اور زیادہ گہری نظر سے مسلمانوں کے علوم عقلیہ کا مطالعہ کرکے دنیا کو یہ بتلاتے کہ افکار انسانی کے نشوو ارتقا میں درحصل مسلمانوں کا حصہ کتنا اور کیسا ہے، اور وہ خاص اسلامی عنصر کونسا ہے جس نے فکر و نظر کے ہر گوشہ میں اپنا اثر ظاہر کیا۔ ایک مغربی مصنف (O'leary نے اس موضوع پر ایک کتاب Arabic Thought And Its Place In History کے نام سے لکھی ہے، مگر وہ غریب خود فکر اسلامی سے نا آشنا تھا۔ اس لیے وہ اس موضوع کے ساتھ انصاف نہ کرسکا۔ یہ فرض درحصل مسلمانوں ہی کے ذمہ واجب الادا ہے، اور اس سے وہی لوگ اچھی طرح سبکدوش ہوسکتے ہیں جنہوں نے علوم قدیمہ اور علوم جدیدہ دونوں کی تعلیم حاصل کی ہے۔

کتاب میں چند باتیں اصلاح طلب بھی ہیں جن پر امید ہے کہ دوسری اشاعت کے موقع پر نظر ثانی کی جائے گی۔

قرآن مجید میں جس چیز کو لفظ "حکمت" سے تعبیر کیا گیا ہے وہ نہ تو انگریزی لفظ (Rationalism کی ہم معنی ہے اور نہ (Free thinking کی۔ انیسویں صدی کے مسلمان مصنفوں نے محض اشتراک لفظی سے فائدہ اٹھاکر قرآن کی حکمت کو حکمت بمعنی جدید سے ملا دینے کی کوشش کی تھی، مگر وہ اس وقت کی بات تھی جب ہماری جدید علمی تحریک اپنے عہد طفولیت سے گذر رہی تھی۔ اب نسبتہً بلوغ کا زمانہ ہے اور ہمارے محققین کے لیے یہ مناسب نہیں کہ اپنے استدلال کی عمارت ایسی کمزور بنیادوں پر اٹھائیں۔

اعتزال کے لیے (Rationalism) اور اشعریت کے لیے (Scholasticism) کی

اصطلاحیں بھی درست نہیں۔ انگریزی پڑھنے والوں کے ذہن ان اصطلاحوں سے جن مفہومات کی طرف منتقل ہوں گے وہ اعتزال اور اشعریت کی خصوصیات سے بڑی حد تک مختلف ہیں۔ فاضل مؤلف نے اعتزال اور اشعریت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے شبہہ ہوتا ہے کہ انہوں نے خود بھی ان دونوں مذاہب کی حقیقت پر اچھی طرح غور نہیں کیا ہے، اور زیادہ تر مولٰنا شبلی مرحوم کی کتابوں پر اعتماد کرکے ایک رائے قائم کرلی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے نہ صرف اصطلاحوں کے استعمال میں غلطی ہوئی ہے، بلکہ ان کے بیان کا پلڑا ہر جگہ اعتزال کی طرف جھک گیا ہے۔ وہ معتزلہ کو "مسلمان مفکرین کا سب سے زیادہ ریشنلسٹ گروہ" سمجھتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں اشعریت کو ایک ارتجاعی (Reactionary) تحریک قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اعتزال ہمیشہ خام فلسفیت سے پیدا ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ اسلام کے ابتدائی دور میں جو اعتزال رونما ہوا وہ بھی دراصل خام فلسفیت ہی کا نتیجہ تھا۔ جب تک مسلمانوں میں عقلیات کا مطالعہ محض سطحی رہا اور تنقید کا مادہ پیدا نہ ہوا اس وقت تک علم کلام میں اعتزال کا اور فلسفہ و طبیعیات میں حکمائے یونان سے مرعوبیت کا دور دورہ رہا۔ مگر جب چوتھی اور پانچویں صدی میں بلوغ کا عہد آیا اور زیادہ گہری نظر رکھنے والے مفکرین پیدا ہوئے تو انہوں نے کلام اور فلسفہ اور منطق پر تنقید شروع کردی اور ایک ایک کرکے ان غلطیوں کے پردے چاک کرنے شروع کردیے جو ابتدائی دور کے متکلمین اور حکما رنے کی تھیں۔ اشعریت اس دور تنقید کی محض ایک ابتدائی چیز تھی اس لیے خام نظر آتی ہے۔ آگے چلکر امام غزالی امام رازی، علامہ ابن تیمیہ اور دوسرے لوگوں نے جب عقلیات اسلامی کو کمال پر پہونچایا تو اعتزال طبعی موت مرگیا اور اشعریت کی صورت بدل کر کچھ سے کچھ ہوگئی۔

مؤلف نے ایک طرف تو اعتزال کو "ریشنلزم" کا ہم معنی قرار دیا ہے، اور دوسری طرف یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ "ریشنلزم" کی روح خود صحابہ اور تابعین کے گروہ میں پیدا ہوچکی تھی۔ اس سے ایک شخص یہ دھوکا کھا سکتا ہے کہ صحابۂ کرام اور تابعین میں بھی کچھ لوگ اعتزال کی طرف میلان رکھتے تھے، حالانکہ

یہ بالکل غلط ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ کے متعلق مؤلف نے وثوق کے ساتھ لکھدیا ہے کہ وہ معراج جسمانی کی قائل نہ تھیں حالانکہ یہ کسی معتبر روایت سے ثابت نہیں۔ ابن ہشام نے اس روایت کو محمد بن اسحاق سے لیا ہے اور محمد بن اسحاق نے اپنے ذریعۂ علم کی تصریح نہیں کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھ سے خاندان ابوبکر کے کسی شخص نے ایسا کہا تھا۔ مگر ان کا زمانہ حضرت عائشہ سے اس قدر بعید ہے کہ خاندان ابوبکر کے جس شخص نے بھی ان سے یہ روایت بیان کی ہوگی وہ بہرحال ایسا شخص نہ ہوگا جس نے ام المومنین کی صحبت پائی ہو۔ لہٰذا اس کے اور حضرت عائشہ کے درمیان ایک واسطہ اور چھوٹ جاتا ہے۔ پس یہ روایت ایسی ہے جس کا ایک راوی بیچ سے غائب ہے، اور ایک راوی مجہول ہے۔ کیا ایسی کمزور روایت کی بنا پر وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ام المومنین کا یہی مسلک تھا؟ یہ دراصل انیسویں صدی کے معتزلہ کی خصوصیت تھی کہ وہ اپنے مسلک کی تائید میں ہر چھوٹے سے چھوٹے تنکے کا سہارا ڈھونڈتے تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے معراج کے متعلق اپنا نظریہ پیش کیا تو یہ روایت ان کے ہاتھ لگی اور انہوں نے بہت غنیمت سمجھ کر اس کو لے لیا۔ مگر جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، وہ طفولیت کا زمانہ تھا بچپن کی باتیں اس وقت نبھ جاتی تھیں۔ اب اس دور بلوغ میں ارباب تحقیق کو زیب نہیں دیتا کہ ایسے کمزور سہاروں پر استدلال کی بنیاد اٹھائیں۔

قانون بین الممالک تالیف مولوی محمد حمید اللہ صاحب استاذ جامعۂ عثمانیہ ضخامت ۲۰۰ صفحات قیمت عہ ۴ ر ملنے کا پتہ: مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن۔

یہ کتاب بین الاقوامی قانون یا باصطلاح مؤلف "قانون بین الممالک" پر درسی اغراض کے لیے لکھی گئی ہے۔ مؤلف کا یہ خیال صحیح نہیں کہ اردو کے لیے یہ موضوع بالکل نیا ہے۔ اس سے پہلے بھی ایک شخص بین الاقوامی قانون کے شعبۂ جنگ پر تفصیل کے ساتھ لکھ چکا ہے۔